تحریکِ اسلامی

آج کے قابلِ غور مسائل

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

تحریک اسلامی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ظاہری حرکت اور بعض اوقات ہلچل کے باوجود دنیا میں تحریک اسلامی کو ایک لمحہ فکر میں ٹھٹکے ہوئے ہونے سے تعبیر کرنا درست ہو گا۔ یہ ٹھٹک جانا' نہ بلا سبب ہے نہ نامناسب اور بے موقع۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ایسا ہونا ناگزیر تھا اور یہ امر خوش آیند ہے کہ اس کا شعور عام ہو چلا ہے۔ جن اہم سوالات نے اس مسافر کو جو ابتداً بڑے ذوق و شوق سے مگر کچھ عرصے سے جھجکتا ہوا ایک راہ پر چلا جا رہا تھا اب رک کر پیچھے دیکھنے اور آگے بڑھنے سے پہلے راہ متعین کرنے پر مجبور کر رہا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ وہ تحریک جو تبلیغ و اشاعتِ افکار' پھر تنظیم اور سیاسی جدوجہد کا طریقہ اختیار کر کے آگے بڑھی تھی' ان حالات میں کیا کرے' جب حکمراں قوتیں ان میں سے کسی بات کی اجازت نہ دیتی ہوں۔

۲۔ مذکورہ صورت حال کے علاج کے لیے جمہوریت کی بحالی کو مقصود بنا کر اس پر قوتیں صرف کرنا ایسی صورت میں کس حد تک مفید ہو سکتا ہے جب کہ عوام کی غالب اکثریت ناخواندگی اور جہالت' اندھی تقلید اور جذباتیت نیز معاشی مفلوک الحالی اور مفاداتِ محفوظہ (Vested Intersts) کی کاسہ لیسی کے سبب اپنے حق رائے دہی کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے سے بھی قاصر رہ سکتی ہو۔

۳۔ تحریک ان ممالک کی نسبت عملاً کیا موقف اختیار کرے جو اسلامی نظام قائم کرنے کے دعوے میں اس سے پیچھے نہیں مگر خود اسے آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتے۔

ان تینوں سوالات کا تعلق تو تحریک کی حکمت عملی (Strategy) سے فوری قسم کا ہے' جن کا کوئی واضح جواب دیے بغیر آگے بڑھنا محال ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے امور و مسائل بھی ہیں جن میں یکسوئی ضروری ہو گئی ہے۔ ان امور و مسائل کے ذکر سے پہلے ان کی تمہید کے طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ چالیس سالہ فکری کوششوں کے باوجود سماجی علوم اور انسانی زندگی کی تعمیر نو سے متعلق جو مواد

پیش کیا جا چکا ہے اس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک گروہ اب بھی مطمئن نہیں ہو سکا ہے' اور بہت سے ایسے سوالات اٹھائے جا چکے ہیں جن پر غور و بحث کی ضرورت باقی ہے۔ بہت سے امور میں ابھی کوئی ایسی رائے نہیں بن سکی ہے جس پر تحریک اسلامی کے حلقے متفق ہوں یا عصر حاضر کے تعلیم یافتہ مسلمان مطمئن ہوں۔ خاص طور پر معاشی اور معاشرتی زندگی کے باب میں یہ امر اب بھی وضاحت طلب ہے کہ اسلام کی امتیازی دین (Contribution) کیا ہے اور اسے قبول کرتے ہوئے دور جدید کے مسلمان انسانی عقل و تجربہ اور معاصر نظاموں سے اخذ و ترک کا طریقہ کس حد تک اختیار کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل امور و مسائل کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ابھی تک یہ تحریکیں عام انسانوں کو مخاطب کر کے ان کے کسی معتد بہ گروہ کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ حالانکہ وہ اس دعوے کے ساتھ آگے بڑھی تھیں کہ اسلام دین انسانیت ہے' انسان کو اسلام کی ضرورت ہے اور اسلام ہی جدید انسان کے دکھ درد کا مداوا فراہم کر سکتا ہے۔ آج مسلمانوں اور عام انسانی دنیا کے درمیان ذہنی سطح پر عمل اور ردعمل کا جو کھلا عمل مسلسل جاری ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم دنیا پر کسی نمایاں فکری اثر (Impact) کے بغیر مسلم دنیا کو اسلام کے حق میں اس حد تک یکسو کر لینا دشوار ہو گا کہ وہ اسے اپنی اجتماعی زندگی کی اساس بنا لیں۔ اگر عام انسانی فکر' بالخصوص ان امور کی بابت افکار پر' جو سماجی علم کا میدان بحث ہیں' اسلامی اثرات مرتب ہو جائیں تو مسلم دنیا پر بھی اس کے دور رس اثرات پڑ سکیں گے۔

ذیل میں جن امور و مسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ سماج کے لیے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت سے تحریک اسلامی کا موقف مخاطب کے قبول یا عدم قبول کا سبب بن سکتا ہے۔

۱۔ تحریک اسلامی کے طریقہ کار میں اشاعت افکار سے زیادہ زور اسلامی قدروں کے عملی رواج پر دینا افکار و تصورات کو ذہنوں میں جاگزیں کر دینے اور عملی رویہ تبدیل کر کے انسانوں کو اسلامی قدروں کی تحصیل میں لگا دینے میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر کو ثانی الذکر کا ذریعہ بنانا ناگزیر ہے۔ لیکن مطلوبہ نتائج کا ظہور تمام تر صرف تبلیغ و اشاعت افکار سے عمل میں نہیں آ سکتا۔ دوسری طرف داعی گروہ اگر معاشرہ میں اعلیٰ اقدار حیات کو رواج دینے کی عملی کوشش میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لے تو اس سے اسلامی افکار و تصورات کے قبول عام کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اس گروہ کو معاشرے میں یہ شہرت حاصل ہونی چاہیے کہ یہ سارے انسانوں کو یکساں طور پر آزاد سمجھتا ہے اور کسی فرد یا گروہ کو دوسروں پر حکومت جتانے کا حق دار نہیں سمجھتا بلکہ اجتماعی امور کے باہمی مشورہ سے طے پانے کے اصول پر کاربند ہے۔ وہ دولت کو خدا کی امانت سمجھ کر اعتدال کے ساتھ اپنے صرف میں لانے کے ساتھ اس میں سماج کا ایک حق تسلیم کرتا اور زندگی کو باہمی تعاون سے گزارنے کا قائل ہے جس میں

خداداد وسائل سے سب فیض یاب ہو سکیں ۔ اس کا عمل اور سماجی امور میں موقف اس بات پر گواہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانی معاشرے کو مساوات' عفت و پاکبازی' رحمت و شفقت اور کمزور کی حمایت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس گروہ سے توقع کی جاتی ہے کہ معاشرے میں اچھائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کی روک تھام کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہ کرے گا ۔ ایک ایسے ہی گروہ کی عملی کوششیں انسانوں کے عملی رویے کو ان قدروں کے مطابق ڈھالنے اور ان مقاصد کا خادم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے ۔ یہی طریق کار تحریک اسلامی کو عصر جدید کی ان سیکولر تحریکوں سے ممتاز کر سکتا ہے جو ابتدا ہی سے اپنا مرکز توجہ سماج کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلی کو بناتی ہیں اور انسان کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتیں ۔ نیز یہی طریق اختیار کر کے ان ملکوں میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے جن کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمان نہیں ہے ۔ اپنی طویل تاریخ میں مسلمان اسلام کے نام پر مختلف قوموں سے ٹکرائے بھی ہیں اور اس ٹکراؤ کی اور اس کے نتیجے میں مغلوبیت کی تلخ یادیں آج بھی ان قوموں کے ساتھ ہیں ۔ ان کے دل و دماغ کو نفرت اور بیزاری کے زہر سے پاک کر کے ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے حسن ظن پیدا کرنے میں' تاکہ وہ دعوت اسلامی پر کھلے دل و دماغ سے غور کر سکیں' مذکورہ بالا طریق کار سے بڑی مدد مل سکتی ہے ۔ لیکن یہ طریق کار اختیار کرنے کے لیے پیمبرانہ وسیع النظری اور عالی حوصلگی کی ضرورت ہے' جس سے دور حاضر کی سیاسی مزاج کی تحریکیں بالخصوص اشتراکی تحریک بالکل عاری رہی ہے' اور اس مزاج عصر کے اثرات سے اسلامی حلقے بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں ۔

۲۔ مسلمان عوام کی ناخواندگی اور جہالت اور مسلم ممالک کی معاشی پسماندگی دور کرنے کی اسلامی اہمیت ..... یہ سوال اس لیے اہمیت حاصل کر گیا ہے کہ ایک طرف تو موجودہ صورت حال خود ان تحریکوں کے پیغام کو سمجھنے اور قبول کرنے میں مانع ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر ان کی دعوت قبول کر لی جائے تو اس صورت حال کو بدلے بغیر مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہونا دشوار ہے ۔ آج کی دنیا میں بڑی طاقتوں پر انحصار کرنے والی اور ناطاقتی کا شکار محتاج قومیں تہذیبی خود ارادیت سے بھی محروم ہیں ۔ ان کی یہ کیفیت ان کے ان اجتماعی فیصلوں کے نفاذ میں مانع ہو گی جو بڑی طاقتوں کی پسند اور مزاج کے خلاف ہوں ۔ مزید برآں عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے زبردست استیلا اور اسلامی دنیا میں ان کے جارحانہ عزائم رکھنے والے ایجنٹوں کا وجود ایک ایسا چیلنج ہے جس کے مقابلے کے لیے فوجی طاقت بھی ناگزیر ہے ۔ اس طاقت کی فراہمی کے لیے تعلیم' بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی میں زبردست پیش رفت اور بڑے پیمانے پر صنعتی عمل (Industrialisation)

ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ ان کاموں کی اسلامی اہمیت کیا ہے اور وہ ان کو اپنی دعوت اور نظام اصلاح و تربیت میں کیا مقام دیتی ہے؟ اس سوال کے جواب پر ان جماعتوں اور ان کے وطن کے حکمرانوں نیز سماج کے بعض دوسرے طبقات سے ان کے ربط و تعلق کی نوعیت کا بھی انحصار ہے۔ مغربی ایشیا کی تازہ ترین جنگ جس طرح شروع ہوئی' جس طرح رکی اور جس طرح بڑی طاقتیں ان میں شریک رہیں' اس نے اس سوال کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ نیز اسی سے یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اسلامی ممالک میں حکمرانوں اور اسلامی تحریکوں کا باہمی ٹکراؤ کس حد تک ضروری یا مفید ہے؟ اس امر پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جس حد تک یہ ٹکراؤ عالمی سطح پر اسلام دشمن استعماری قوتوں کی ریشہ دوانیوں اور ذہنی استیلا کا نتیجہ ہے' اس حد تک اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صحیح حکمت عملی کیا ہے؟ کیا یہ زیادہ مفید نہ ہو گا کہ یہ لڑائی اپنے اصل محاذ پر لڑی جائے اور دشمن کو اس سازش میں ناکام بنایا جائے کہ یہ لڑائی ہمارے ہی گھروں کے اندر لڑی جاتی رہے۔

۳۔ اسلامی نظام کے قیام میں تدریج کا ناگزیر ہونا ماضی کے تجربات اور حال کی سنگین صورت حال نے اس بات کو زیادہ اہم بنا دیا ہے کہ تحریک کے کارکن یہ سمجھ کر آگے بڑھیں کہ ان کا مقصود رفتہ رفتہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ عرصہ تک تعلیم و تربیت اور تعمیری کاموں کی ضرورت ہے' بلکہ تجربات کے مراحل سے بھی گزرنا ہو گا اور خارجی موانع یا عارضی مسائل کے سبب بھی حصول مقصد کا عمل سست رفتار ہو سکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حکومتوں سے بہت سی قانونی تبدیلیوں کے مطالبے کو اولیت حاصل ہونی چاہیے یا کچھ اور کاموں کو' کیونکہ عصر حاضر میں اصل مسئلہ متعین اور معلوم اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہے۔ یہ کام خود ایک بڑے کام کا جزو ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی میں عدل و انصاف' آزادی و مساوات' عفت و پاک بازی' سکون خاطر اور طمانیت قلب کے وہ مقاصد کس طرح حاصل کیے جائیں جن کے لیے یہ قوانین دیے گئے ہیں اور دوسرے قوانین بھی بنانے ہوں گے' مگر جو صرف قانون سے نہیں حاصل ہو سکتے بلکہ ان کے حصول کے لیے پہلے انسانوں کے خیالات و افکار' مزاج و رجحان اور حوصلوں میں تبدیلیاں درکار ہوں گی۔

۴۔ اسلامی نظام کے قیام تک' اسی مقصد کے لیے ملک کے موجودہ نظام میں اشتراک و تعاون کا مسئلہ

اس مسئلے کی نوعیت مذکورہ بالا تینوں نکات کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر اسلامی تحریکیں دستوری اور قانونی مطالبات پر اسلامی قدروں کے عملی رواج' تعلیم و تربیت' مادی تعمیر و استحکام وغیرہ کاموں کو ترجیح دینا طے کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ملک کی انتظامی مشینری سے کنارہ کش رہیں۔

۵۔ معاصر انسانیت اور اسلام کے درمیان اتفاق و اختلاف کے نکات کا تعین۔

۶۔معیشت و سیاست کی تنظیم اور معاشرتی زندگی میں اسلام کے دائرے میں انسانی آزادی کی وسعتیں۔

۷۔اسلام کے سیاسی نظام میں غیر مسلم کا مقام۔

۸۔اسلامی سماج میں عورت کا مقام۔

ان امور پر ہم آیندہ صفحات میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔

۹۔اسلامی زندگی کی تنظیم نو میں فقہ مرتب کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور سنت کا صحیح مفہوم۔اصولی طور پر تحریک نے اس باب میں جو موقف ابتدا میں اختیار کیا تھا وہ بدلتی ہوئی دنیا میں اللہ کی دائمی ہدایت پر عمل کے دشوار مسئلے میں صحیح راہ نمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔یہ موقف یہ تھا کہ قرآن و سنت کے منشا کے تعین میں جملہ انسانی اجتہادات و آرا قابل ترمیم ہو سکتی ہیں اور انسان صرف ان ہدایت کا پابند ہے جن کا اسے قرآن و سنت کی نصوص پابند بناتی ہوں۔نبی اکرمؐ کی دی ہوئی ہدایات میں سے جن ہدایات کا تعلق خالصتاً دنیوی معاملات سے ہو' مثلاً زراعت یا علاج معالجے کے طریقے وغیرہ یا اخلاقی مقاصد کے تحت دی گئی جن ہدایت کا تعلق ایسے حالات سے ہو جو اب نہیں پائے جاتے یا جن کا تعلق ان خالصتاً انتظامی اور وقتی امور سے رہا ہو جن سے آپ کو اسلامی ریاست کے صدر کی حیثیت سے عہدہ برآ ہونا تھا' ان کے فہم و تعبیر میں ان کے اس پس منظر کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ لیکن جب عملی مسائل پر غوروبحث کا مرحلہ آتا ہے' کسی جدید مسئلے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے' یا مسلمان معاشروں میں رائج ایسے طریقہ کی اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے جو اجتہادی احکام پر مبنی تھے مگر اب اجتماعی مفاد و مصالح کے خادم نہیں نظر آتے تو تحریک سے وابستہ اصحاب علم بسااوقات مذکورہ بالا اصولی موقف کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ان کا طرز استدلال اور ان کی آخری رائے کلیات دین پر مبنی اجتہاد کی بجائے جزئیات فقہ کی تابع نظر آتی ہے۔وہ سنت سے مقاصد و مصالح اخذ کرنے پر قانع نہیں ہوتے' بلکہ شکلوں اور تفصیلات میں وہی طریقے قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو پہلے اختیار کیے جا چکے ہیں۔اس طرح مختلف جدید مسائل یا قابل اصلاح قدیم رواجوں کے ضمن میں ان کا موقف مزاج عصر کی رعایت سے قاصر اور عدل و انصاف' انسانی شرف اور اجتماعی مفادات و مصالح کے اس جدید ترین فہم سے متغائر ہوتا ہے جو انسان نے اپنے حالیہ تجربات سے اخذ کیا ہے۔اس مغائرت کا مظاہرہ مختلف علاقوں میں مختلف عملی مسائل پر غوروبحث کے ضمن میں ہوا جن میں سے مثال کے طور پر چند کا ذکر کیا جا سکتا ہے: عائلی قوانین میں اصلاح' اسلام کے قانون فوجداری کی بعض دفعات' آرٹس' پردہ' تصویر' خاندانی منصوبہ بندی اور مشینی ذبیحہ۔

اب ہم اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا چار نکات پر روشنی ڈالیں گے۔

عصر حاضر کے انسانوں کے عام ذہن و مزاج کا جائزہ لیا جائے تو جہاں بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو اسلام سے اس کی دوری بڑھا رہی ہیں وہاں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنھوں نے اسے اسلام سے قریب تر کر دیا ہے۔ ان انسانوں کو دعوت اسلامی کا مخاطب بناتے وقت دونوں ہی طرح کی باتوں کو سامنے رکھنا اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مذہب اور ہدایت الٰہی سے جدید انسان کا رشتہ بہت کمزور ہو چکا ہے بلکہ اجتماعی امور حیات میں یہ رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا ہے۔ آخرت کا کوئی ایسا شعور جو ایک مثبت ضابطہ اخلاق کی بنیاد بن سکے 'مفقود ہے ' خواہ یہ فقدان انکار آخرت کے سبب ہو یا شفاعت کے تصور پر مبنی ہو۔ جملہ امور زندگی کے بابت فیصلوں کے لیے عقل انسانی کے خود کفیل ہونے کا احساس اور آزادی کا غیر معتدل تصور 'نہ تو عقل انسانی کی محدودیتوں کا نوٹس لیتا ہے' نہ اجتماعی مصالح کے تحت انفرادی امیدوں پر ضروری قید و بند گوارا کرتا ہے۔ اس رجحان کا سب سے بھیانک نتیجہ بڑھتی ہوئی اباحیت (Permissiveness) اور صنفی زندگی میں حیا اور عفت اور نظم و ضبط کے تمام پیمانوں کا ٹوٹ جانا ہے۔ مادی سامان زندگی کی فراہمی' عیش کوشی اور قومی سطح پر طاقت اور دوسری قوموں پر سیاسی اور معاشی استیلا کے مقاصد اب بھی محبوب ہیں 'اگرچہ بعض انسانی گروہوں میں ان کے خلاف شدید ردعمل بھی پیدا ہو چلا ہے۔

دوسری طرف زندگی کے چند ایسے اصول و مقاصد کو جن کی اسلام نے ایسے حالات میں تعلیم دی تھی جب دنیا ان سے روگرداں تھی' آج ساری انسانیت قبول کر چکی ہے۔ آزادی' مساوات' جمہوریت' سماجی عدل اور انسانی عزو شرف کے تصورات کی عملی تعبیروں میں اختلاف کے باوجود یہ بات بہت اہم ہے کہ اب دنیا ان پر متفق ہو چکی ہے۔ اسی طرح عملی خلاف ورزیوں کے باوجود امن کی مقصودیت اور جنگ کے سدباب پر سب کا اتفاق ہے۔ سو ڈیڑھ سو برس پہلے کی دنیا اس سے بہت مختلف تھی اور انسانوں کے فکر و مزاج میں یہ تبدیلی تحریک اسلامی کے لیے یقیناً خوش آیند ہے۔

اگر تحریک اسلامی مسلمانوں کو خصوصی خطاب اور ان کی اصلاح و تربیت کے اہتمام کے ساتھ سارے انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا چاہتی ہے تو اسے مذکورہ بالا دونوں باتوں کی رعایت ملحوظ رکھنی پڑے گی اور ان کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ یہ تحریکیں زیادہ تر مسلمانوں ہی میں کام کرتی رہی ہیں جس کا اثر دین کی ترجمانی اور اس کے مطالبات کے تعین دونوں پر پڑا ہے۔ اب اسے اس سوال کا جواب کہ انسان اسلام کو اپنا طریقہ زندگی کیوں بنائے ' ان لوگوں کے لیے بھی دینا ہے جن کا نہ تو وہ آبائی مذہب ہے 'نہ عظمت رفتہ کی یادوں کا خزانہ۔ جس کی طرف نہ مقامی روایات کا تسلسل کھینچتا ہے 'نہ جس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا جذبہ 'سامراجی طاقتوں کے مسلسل ظلم و استحصال کے ردعمل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب اور نئے انداز دعوت کو عصبیتوں ' آرزوؤں اور تاریخی یادوں

کے معیاروں سے آزاد ہو کر فطرت سلیم' عقل عام' انسانی وجدان' مشترک انسانی تجربات اور انسانوں کی عام مشکلات و مسائل کے حل پر مبنی ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے نقشے پر مبنی ہونا چاہیے۔ عصر حاضر میں اسلامی معاشرت' معیشت اور سیاست کا ایسا نکھرا ہوا تصور درکار ہے جو مسلم دنیا کے رسم و رواج اور ان کی روایات سے آزاد صرف اللہ کی دائمی ہدایات پر مبنی ہو اور جس میں مختلف صالح مقامی روایات کو جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔

چونکہ دور جدید کے عام انسان سے ہماری مراد بیشتر مغرب کا انسان یا وہ انسان ہے' جس کے ذہن و مزاج کی تشکیل میں مغرب کے اثرات نے غالب حصہ لیا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس مخصوص رویہ کا ذکر نامناسب نہ ہو گا جو مغرب کی نسبت سے تحریک اسلامی کے حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ جس تاریخی مرحلے میں یہ تحریک ابھری اس میں فطری طور پر اس نے مسلمانوں میں اسلام پر اعتماد کے ساتھ اس کے ایک قابل فخر میراث ہونے کا طاقتور احساس پیدا کیا ہے۔ اعزاز بالاسلام کا یہ جائز جذبہ اپنے جلو میں یہ خیال بھی لایا کہ اسلام ہر اعتبار سے خودکفیل ہے اور دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں کسی اور ماخذ سے راہ نمائی حاصل نہیں کرنی ہے۔ اس جذبے کا ہدف خاص طور پر مغرب اور مغربی تہذیب تھی' جس سے کاٹ کر اسلام کی طرف واپس لانا' تحریکوں نے اپنا اصل کام سمجھا۔ یہ جذبہ تقلید اور روایت پسندی کے اس مزاج کے ساتھ وابستہ ہو گیا جو صدیوں سے ملت نے اختیار کر رکھا ہے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ فرد کی تربیت' معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کے باب میں مغرب کا ہر طریقہ مردود ہے اور ہم اپنا طریق کار تمام تر اپنے ماضی کی روشنی میں خود مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی اس انتہائی شکل میں کہیں لکھی ہوئی نہیں ملے گی مگر اسلامی حلقوں کے عملی رویے اور ان کی تقریروں اور تحریروں میں اس کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

اس جذباتی روش کا اثر اگر صرف معاشرتی زندگی' جماعتی تنظیم کے طریقوں اور قابل اجتہاد مسائل جدیدہ پر غور و بحث پر پڑتا تو بھی اس کے نقصانات اس قابل تھے کہ اس پر کھل کر بحث کی جائے۔ مگر اس سے زیادہ اہم یہ اندیشہ ہے کہ یہ روش' تحریک اور عام انسانوں کے درمیان غیر ضروری حجابات قائم کرنے کا سبب بن جائے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ اسلامی مشرق میں کئی سو سال سے اجتہادی فکر' سماجی علوم کا ارتقا اور مسائل انسانی کے حل کے ضمن میں تجربات کا سلسلہ تقریباً بند رہا ہے۔ جب کہ یہ کام غیر مسلم مغرب میں پوری قوت کے ساتھ انجام پایا ہے۔ بیشتر اوقات ان علوم و تجربات کا تعلق زندگی کے ایسے امور سے ہے جن میں اسلام نے مقاصد کی نشاندہی کی ہے' ذرائع کا تعین نہیں کیا ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کچھ مذاہب عالم کے تاریخی عمل کے نتیجے میں' کچھ اسلام سے براہ راست

فیضان سے اور کچھ اپنے تجربات سے سیکھ کر انسانیت متعدد بنیادی مقاصد حیات اور کلیدی اہمیت رکھنے والی قدروں پر فی الجملہ متفق ہو چکی ہے۔ مغرب کے آزاد، متحرک اور وسائل سے مالا مال معاشرے میں ان قدروں کی تحصیل کے لیے مختلف النوع تجربات ہوتے رہے۔ ہم ان تجربات سے نہ صرف یہ کہ بے نیاز نہیں رہ سکتے بلکہ قرآن و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں ان سے پورا فائدہ اٹھا کر ہی مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں شورائیت، مساوات بنی آدم اور عدل اجتماعی کے قیام کے لیے خود ہمارا ماضی ہماری تفصیلی رہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی کے بنیادی حالات بدل گئے ہیں۔ انسانی آبادی کی کثرت، حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی سرعت و سہولت، علم حاصل کرنے اور سمجھانے نیز معلومات کے منظم استعمال کے طریقوں کے ارتقا اور وسائل قدرت سے استفادے میں غیر معمولی ترقی نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں اسلامی مقاصد و اقدار کی تحصیل کے لیے جہاں خود اجتہاد و اختراع ضروری ہے وہاں اب تک کے انسانی اجتہادات و اختراعات سے استفادہ بھی ناگزیر ہے۔ یہ عمل اگر شعوری طور پر اور قوت کے ساتھ انجام پانے لگے تو تحریک کو قوت کا ایک نیا منبع حاصل ہو سکے گا اور اس کے اور عام انسانوں کے درمیان ربط زیادہ پائیدار بنیادوں پر قائم ہو سکے گا۔ مغرب کے خلاف ایسی عصبیت، جو خوب و ناخوب میں امتیاز نہ کر سکے، مشرقی سماج کی ان تقلیدی روایات کے بقا و تسلسل کا ذریعہ بن سکتی ہے جن کو اسلام کی دائمی ہدایات کی کوئی سند حاصل نہیں ہے، اور تجربے سے مفید پائے گئے ان نئے طور طریقوں کے اختیار کرنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے جن کو اختیار کرنے کی اسلامی تعلیمات کے مطابق پوری گنجائش موجود ہے۔ تحریک اسلامی کو مسئلہ کے اس پہلو سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اسلامی سماج کو مغرب زدگی (Westernisation) سے بچانے کی کوشش جو بلاشبہ مطلوب ہے، اس انداز سے کی جائے کہ وہ اس سماج کو جدید بنانے (Modernisation) کی راہ میں رکاوٹ بن جائے کیونکہ یہ عمل سماج کی اسلامی تعمیر و ترقی کے لیے بھی ناگزیر ہے اور تاریخی قوتیں اسے روبکار لانے پر مُصر بھی ہیں۔

اب قوموں کے درمیان ربط و اختلاط اتنا بڑھ چکا ہے اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر اشتراک و تعاون اتنا ناگزیر ہو چکا ہے کہ کسی علاقے میں بھی انسانوں کا دوسروں سے کٹ کر اپنی زندگی کو منظم کرنا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں اسلامی سماج کی تعمیر کا نقشہ بناتے وقت غیروں کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کی کیفیت پر از سرنو غور ضروری ہے۔ یہ مسئلہ اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں یا عالمی سطح پر قائم نمائندہ اداروں کے باہمی ربط و تعلق تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم پہلو اسلامی سماج میں غیر مسلم شہریوں کے سیاسی حقوق بھی ہیں۔ حالات میں جو بنیادی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں ان کے پیش نظر اب ماضی میں اسلامی تاریخ کا کوئی ماڈل من و عن دہرایا نہیں جا سکتا بلکہ ہمیں تاریخ سے آگے

بڑھ کر خود تاریخ ساز قوت یعنی قرآن کریم کی روشنی میں اپنا طریقہ کار متعین کرنا ہو گا۔ اسلامی اصول اس بات کے متقاضی ہیں کہ مستحکم امن کے قیام اور مشترکہ انسانی مقاصد کے حصول کے لیے عالمی سطح پر مسلمان ملکوں اور غیر مسلم ممالک کے درمیان اشتراک عمل اور تعاون پایا جائے۔ اسی طرح یہ مناسب ہو گا کہ اندرون ملک بھی غیر مسلم شہریوں کو مسلمان شہریوں کے پہلو بہ پہلو برابر کے شہری حقوق حاصل ہوں اور انھیں اجتماعی مقاصد کے لیے کی جانے والی تمام کوشش میں حصہ لینے کا پورا موقع ملے۔ قرآن و سنت کے مطابق طے شدہ دستوری ڈھانچے میں بھی معیشت کی تنظیم اور عام امور مملکت کی انجام دہی میں انھیں پوری طرح شریک رکھا جاسکتا ہے۔ تحریک اسلامی کی جانب سے اس نکتہ کی مزید وضاحت ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ضروری ہے جو مسلمان ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں میں پائی جاتی ہیں اور جن کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست کے قیام کی مخالفت کر سکتے ہیں۔

اسلامی سماج میں عورت کے مقام بالخصوص سیاست اور معیشت میں اس کے حقوق پر اسلامی تحریکوں نے جو آرا ظاہر کی ہیں وہ مختلف پہلوؤں سے غیر اطمینان بخش ہیں۔ ایک طرف تو ان رایوں کے درمیان خاصا اختلاف ہے اور دوسری طرف اکثر رایوں پر مقامی روایات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس طرح اس بات کا اہتمام بھی پوری طرح نہیں کیا جاسکا ہے کہ قران و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں جدید عورت کے حوصلوں اور توقعات کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی معتدل راہ تجویز کی جائے بلکہ اکثر اوقات ایسے فقہی جزئیات اور سابقہ نظیروں کو بھی فیصلہ کن اہمیت دے دی جاتی ہے جو ایک خاص زمانے اور کسی خاص مقام کے لیے ہی موزوں ہو سکتی ہے۔ یہ رائے ان لوگوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جو مغرب کی بے اعتدالیوں سے بیزار ہیں، اور عورت کے امتیازی وظیفہ حیات کا پورا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔ تحریکی حلقوں کی موجودہ صورت حال دیکھ کر یہ شبہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ مشرق کے مسلمان معاشرے کے موجودہ طرز عمل پر راضی ہیں کیونکہ اس نے اس کو بدلنے اور عورت کو انسانی زندگی کی تعمیر کے اس عمل میں پوری طرح شریک کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی ہے، جس کا نام تحریک اسلامی ہے۔

جن امور و مسائل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تحریک اسلامی کے حلقوں میں ان کا شعور پایا جاتا ہے اور یہ احساس بھی کہ آگے بڑھنے کے لیے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ ناگزیر ہے۔ تحریک کا نیا عالمی مرحلہ اور اس کو آگے بڑھانے میں مغربی ممالک میں مقیم اعلیٰ تعلیم یافتہ ابنائے تحریک کا سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اب ان مباحث میں بھی حصہ لیا جائے اور ان کوششوں میں عملاً شریک اور دخیل بنایا جائے جو سیاست، معیشت اور معاشرت کی تنظیم نو، بین الاقوامی تعلقات کی استواری، عالمی امن کے قیام اور عالمی سطح پر اقتصادی اور سماجی عدل کے قیام کے سلسلے میں جاری ہیں۔ اس طریقے

سے یہ ممکن ہے کہ ان امور کی بابت اسلام جو ہدایات و رہنمائی دیتا ہے اسے متعلق انسانی مصالح اور عقل عام کے لیے قابل قبول استدلال کی بنیاد پر سب کے سامنے پیش کر کے انسانوں کو اسلام سے مانوس کیا جاسکے۔ اسلامی تصور حیات و کائنات کے تعارف اور اسلامی عقائد کی تلقین کی جو براہ راست کوششیں کی جائیں گی ان کے لیے یہ طریقہ زمین ہموار کرنے کا سبب بنے گا کیونکہ اسلام میں انسانی مسائل کے حل، اس کے تصور حیات و کائنات اور عقائد سے براہ راست مربوط ہیں۔ مثال کے طور پر خدائے واحد سے ہر فرد کا براہ راست تعلق اور اس تعلق کی بنا پر دوسرے انسانوں سے مفادات و مقاصد کے اشتراک کا احساس، نیز غیراللہ سے بے نیازی اور توحید پر مبنی آزادی فکر و ضمیر ہی سماجی عدل، مساوات اور آزادی کی متفق علیہ قدروں کی تحصیل کے لیے پایدار بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ وہ گروہ جو اپنے فکر و عمل میں ان تصورات اور قدروں کے حق میں مخلص ہو کر تمام انسانوں کے ساتھ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے اشتراک عمل کرے گا عام انسانوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب اور جس حد تک اس عمل میں افراد اور جماعتوں کے ساتھ حکومتیں بھی شریک ہو سکیں، اسے مزید تقویت حاصل ہوگی۔ اس عمل کی راہ نمائی اور اسے ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے انسانی سماجی فکر کا مسلسل ارتقا ضروری ہے۔ فلسفہ، ادب اور علوم عمرانی میں اسلامی طرز فکر کی موثر نمایندگی اور ان کے اندر ان وسیع تبدیلیوں کے لیے بنیادیں فراہم کرنا جو انسانی زندگی میں اسلام کو مطلوب ہیں، عالمی سطح پر کوئی نمایاں اثر (impact) ڈالنے کے لیے شرط لازم ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں اور علمی مجالس اور دوسرے تعلیمی اداروں کو اس کام کی طرف متوجہ کیا جانا چاہیے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ ہماری دینی درس گاہیں کس طرح اس مقصد کے لیے مفید بنائی جا سکتی ہیں۔ سردست ہمارے جدید تعلیمی ادارے خود شناسی سے اور قدیم درس گاہیں اس احساس سے عاری ہیں کہ انھیں دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں بھی کوئی کردار ادا کرنا ہے جس کے سبب اسلامی تحریک کو خاطر خواہ ذہنی قوت نہیں میسر آسکی ہے۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آیند قرار نہیں دی جاسکتی۔ اگر یہ رائے درست ہے کہ سیاسی اور سماجی انقلاب کی راہ علمی اور فکری انقلاب ہی ہموار کر سکتا ہے تو ابھی راہ ہموار کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مطبوعات کی کثرت اور نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ابھی مختلف علوم بالخصوص انسانی علوم (Human Sciences) میں مغربی اساتذہ کے لائق شاگردوں سے اونچا معیار نہیں پیش کیا جاسکا ہے۔ اور تحریکی حلقوں میں مختلف کاموں کی اہمیتوں کے اعتبار سے درجہ بندی میں بھی علم و ادب اور تحقیق و تفتیش کو وہ مقام حاصل نہیں جو آیندہ کسی زبردست پیش رفت کی بنیاد بن سکے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل

تحریک اسلامی نے اپنا جو دور پورا کر لیا ہے اس نے عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ دین کی جامعیت کا شعور اور اجتماعی زندگی میں دین کی تعلیمات سے روگردانی کا ابطال، اسلام کے موزونیت اور صالحیت پر اعتماد، اس کی طرف رجوع اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا عزم آج کسی مخصوص جماعت یا حلقہ تک محدود نہیں، بلکہ پورے مسلمان معاشرے میں عام ہو چکا ہے۔ سیاسی نظم و اتحاد اور اقتصادی صلاحیت کے اعتبار سے بھی آج اسلامی دنیا وہاں نہیں جہاں اس صدی کے آغاز میں تھی۔ ان روشن پہلوؤں کی ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام کی تفہیم و ترجمانی کا کام اس حد تک انجام پا چکا ہے کہ اب بجز ضد اور ہٹ دھرمی، تعصب اور مفاد پرستی اور جبر و تشدد کے، اسلام کے قبول عام اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں کوئی اور رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یا یہ کہ ہمارے عوام اسلام چاہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ابھی فکری اور علمی سطح پر بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دور جدید کے عام انسان کو دعوت کا مخاطب بنانے کا عمل اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ، ابھی پوری طرح شروع بھی نہیں کی جا سکی ہے اور مسلمانوں کی ۸۰ فی صد ناخواندہ اکثریت میں مذہب کے نام پر خرافات اور مذہبیت کے سہارے نیم جاہل مذہبی پیشواؤں کا وہ تسلط آج بھی قائم ہے جسے ختم کیے بغیر نہ اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے نہ معاشی پس ماندگی دور ہو سکتی ہے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور عصر حاضر میں اسلامی تعمیر نو کے تقاضوں کو پہچان کر انھیں پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بات بھی فیصلہ کن ہو گی کہ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ نے تحریک کے فرد اور لائحہ عمل میں جن نقائص اور کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے ان کو پہچاننے اور دور کرنے میں تحریک کی نئی قیادت کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ نئی قیادت بانیان تحریک کی مقلد محض ثابت ہوتی ہے یا انھی کی طرح اجتہادی فکر سے کام لیتی ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کی نگاہیں اپنے ماضی ہی کی طرف رہتی ہیں اور وہ اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے یا معاصر حالات کے تجزیے اور مستقبل کے بارے میں مبنی بر بصیرت اندازوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرتی ہے۔ ایک راہ تحریک کے لیے جمود اور بالآخر موت کی راہ ہے اور دوسری راہ پر اقدام، کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔